ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ثقافت

(پاکستان اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ ثقافت کا صدارتی خطبہ جو ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو اورینٹل کالج لاہور میں پڑھا گیا تھا۔)

حکیم سقراط کا طریقِ بحث یہ تھا کہ سب سے پہلے موضوع زیرِ بحث میں جو اصطلاح استعمال ہو اس کی تعریف و تحدید کی جائے جو واضح اور جامع و مانع ہو۔ یعنی اس کے مفہوم میں جو کچھ آتا ہے یا آنا چاہیئے وہ اس تعریف میں آجائے اور جو صفت اس سے خارج ہو وہ اس کے اندر آنے نہ پائے۔ منطقی طور پر یہ شرط عائد کرنا تو آسان ہے لیکن اس شرط کے مطابق کسی موضوع کو متعیّن اور مشخص کرنا نہایت دشوار امر ہے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ گدھے اور گھوڑے کا فرق اس طرح بتاؤ کہ بیّن طور پر ان کے صفات و اعمال متمائز ہو سکیں تو غالباً یہ علمی محفل بھی ایک عقلی اور منطقی چکّر میں آجائے اور آخر میں شاید یہی کہنے لگیں کہ تعریف و تحدید برطرف جس نے بھی گدھوں اور گھوڑوں کو دیکھا ہے وہ ان کے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا اور پھر کوئی پوچھے کہ اچھا خچر کی نسبت کیا کہا جائے جو گدھے اور گھوڑے کی آمیختہ نسل ہے۔ وہ نہ گدھا ہے اور نہ گھوڑا، اور دو توانواع کے بہت سے ظاہری اور باطنی صفات اس میں پائے جاتے ہیں، تو فرقِ صفات اور امتیازی خصوصیات اور بھی زیادہ مشوّش ہو جاتے۔ جرمن زبان میں ایک مثل ہے کہ خچر سے اس کے باپ کی نسبت دریافت کیا گیا تو چونکہ وہ پدری رابطے کو باعثِ توہین اور مادری رشتے کو موجبِ توقیر سمجھتا تھا اس نے اصل جواب سے پہلو بچا کر سوال کرنے والے سے کہا کہ کیا تم میرے ماموں کو نہیں جانتے۔ اس مثل کو علامہ اقبال نے بھی اشعار کا جامہ پہنا دیا ہے۔

حیاتِ انسانی کے بعض موضوع ایسے ہیں کہ لوگ انہیں اس قدر واضح اور بدیہی سمجھتے ہیں کہ ان کے مفہوم کے تعیّن کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہر شخص فطرتاً حسن پرست واقع ہوا ہے لیکن اگر کسی بڑے شاعر یا فلسفی سے بھی پوچھا جائے کہ حسن کیا چیز ہے اور کسی چیز یا کسی شخص کو حسین کہنے کے لئے کن شرائط کا ہونا لازمی ہے تو دل و دماغ بے حد الجھن میں پڑ جائیں گے۔ جمالیات کے ماہرین نے درجنوں کتابیں اس پر لکھ ڈالی ہیں لیکن معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ خدا سے بھی اس کی نسبت سوال کیا گیا تو ایک مختصر سا غیر تشفی بخش جواب ہی ملا:

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا | جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا | شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے جب کہ تغیّر سے ہی نمود اسکی | حسیں وہی ہے حقیقت زوال ہے جس کی

اب آپ ہی دیکھئے کہ محض زوال پذیر ہونا فقط حسن ہی کی صفت تو نہیں، دنیا و مافیہا میں جو کچھ بھی ہے وہ زوال پذیر ہے جس طرح حُسن زوال پذیر ہے اسی طرح بد صورتی بھی زوال پذیر ہے۔ آج تک حُسن کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا اطلاق ہر حسین چیز پر نہیں ہوتا۔ اگر آپ مصوّروں سے یا نقادانِ فن سے پوچھیں کہ تصویر میں حُسن کہاں سے آتا ہے اور اس کے مرتبہ حُسن کو جانچنے کا کیا معیار ہے تو بحث میں ایسا اُلجھاؤ پیدا ہو کہ ماہرین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا ہم آہنگ نہ بن سکے۔ حُسن کا حریف جسے عشق کہتے ہیں اس کا بھی یہی حال ہے۔ محبت کسے کہتے ہیں۔ سچی محبت اور جھوٹی محبت میں کیا فرق ہے۔ عشق اور ہوس میں کس طرح امتیاز کر سکتے ہیں۔ محبت جنون ہے یا عقل کی معراج۔ والدین کی اولاد سے محبّت اور بچّے کی ماں سے محبّت میں کیا فرق ہے عشق اکسیرِ حیات ہے یا وہ خود ایک بیماری ہے یا بقول مولانا حالی بیکاروں کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ عشق و محبت کی نسبت ہزاروں باتیں کہی گئی ہیں اور سب کے اندر کچھ نہ کچھ سچائی ہے۔ لیکن مسئلہ صاف نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ محبّت کی نسبت ابھی تک سوچنے والے یہی کہہ رہے ہیں کہ شاید وہ اس صفت کا نام ہے یا شاید اس صفت کا۔ غرضیکہ معاملہ شاید سے آگے بڑھتا نظر نہیں آتا:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ | اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اب آپ شاید دل میں یہ سوچنے لگے ہیں کہ ثقافت کی بحث میں ہیں یہ فلسفی خواہ مخواہ کبھی گدھوں، گھوڑوں اور خچروں کے اصطبل میں لے جا رہا ہے اور کبھی حسن و عشق کا ساز چھیڑ رہا ہے۔ سیدھی طرح یہ کیوں نہیں بتاتا کہ ثقافت سے کیا مراد ہے۔ اسلامی ثقافت کیا ہے اور مسلمانوں کی ثقافت کے امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ حضرت ایک ادارے کے ناظم ہیں جس کا نام ہے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں جس کا نام ہے "ثقافت"، سب سے زیادہ بیّن طور پر تو ثقافت کا مفہوم ثقافت کے ناظم و مدیر پر واضح ہونا چاہیئے۔ لیکن حضرات آپ کو اس بارے میں مایوس ہونا پڑے گا۔ طبیعی اور ریاضیاتی علوم تو آپ کو اتقان و یقین کے ساتھ عناصر کے کون و فساد اور تغیرات کے قانون بتا سکتے ہیں۔ اور تجربہ گاہوں میں تحقیقات کو پرکھ سکتے ہیں۔ لیکن جس سوچنے والے کا موضوع عام زندگی یا مخصوص طور پر انسانی زندگی ہے اس کی کوششیں حیرت سے شروع ہو کر آخر میں پھر

حیرت ہی میں ختم ہو جاتی ہیں:

کاملے گفت است می باید بسے عقل و حکمت "تا شود گویا کسے
یار باید عقل بے حد و شمار تا شود خاموش یک حکمت شعار

یہ تمہید میں نے اس لئے اُٹھائی ہے کہ آپ مجھ سے کوئی غلط اُمیدیں وابستہ نہ کریں اور آخر میں مایوس ہو کر یہ گلہ نہ کرنے لگیں کہ اس مرد سخن ساز نے سوال تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے ہیں، لیکن جواب کے وقت کترا کر نکل گیا ہے۔

اب آئیے اصل موضوع سے دست و گریباں ہوں۔

ثقافت عربی کا لفظ ہے اور اب اُردو میں یہ لفظ کوئی پچیس تیس سال سے استعمال ہونے لگا ہے۔ اب بھی اس کا استعمال عام نہیں۔ تہذیب اور تمدّن کے الفاظ سے تو ہر شخص آشنا ہے لیکن ثقافت کے متعلق مجھ سے بارہا پڑھے لکھے لوگوں نے بھی سوال کیا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ سر تیج بہادر سپروؔ جو اُردو کے عاشقوں میں سے تھے اور ان کا فارسی کا ذوق بھی عام سطح سے زیادہ بلند تھا، عثمانیہ یونیورسٹی میں جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھنے حیدر آباد تشریف لائے۔ گھر سے انگریزی میں خطبہ لکھ کر لائے تھے۔ جب ان سے تقاضا ہوا کہ خطبہ اُردو میں پڑھنا ہوگا تو ترجمے کی زحمت سے بچنے کے لئے اُنہوں نے مجھ سے مدد چاہی۔ میں نے کلچر کا ترجمہ ثقافت کیا تو پوچھنے لگے کہ بھائی یہ کیا چیز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ پہلے تہذیب اور تمدّن کے الفاظ استعمال ہوتے تھے اب ثقافت کا لفظ علمی تحریروں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ تہذیب اور تمدّن دونو پر حاوی ہے۔ مجھ پر اعتبار کر کے اُنہوں نے خطبے میں یہی لفظ استعمال کیا جو ان کے وسیع مطالعہ کے باوجود ان کی نظر سے نہ گزرا تھا۔

بلحاظ مادہ کسی لفظ کے معنی نہایت سادہ ہوتے ہیں لیکن جب وہ لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ثقافت کا عربی سہ حرفی مادہ ثقف ہے جس کے معنی ہیں درست کرنا، سنوارنا اور بل نکالنا۔ چنانچہ تیر کو آگ میں تپا کر سیدھا کرنے کو تثقیف کہتے ہیں:

اقبال عشق نے مرے سب بل دیئے نکال مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

عشق نے اقبال پہ جو عمل کیا اسے آپ ان معنوں میں بے دریغ تثقیف کہہ سکتے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں تہذیب و تمدّن کے الفاظ زیادہ مستعمل ہیں جو انگریزی الفاظ کلچر اور سویلیزیشن کے مرادف ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں تہذیب و تمدّن کی بحثوں میں خلط

بحث ہے۔ یہی حال انگریزی کلچر اور سویلیزیشن کا ہے۔ کوئی لکھنے والا کلچر کو ایسے وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے کہ سویلیزیشن کا مفہوم بھی اس میں آجاتا ہے۔ اور کوئی سویلیزیشن کے مفہوم میں کلچر کے مفہوم کو بھی لپیٹ لیتا ہے۔ ہم نے جو ثقافت کی اصطلاح اختیار کر لی ہے تو اس میں ایک فائدہ ہے اور ایک نقصان ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ ایک ہی لفظ تہذیب اور تمدّن دونو پر محیط ہو جاتا ہے۔ اور نقصان یہ ہے تہذیب و تمدّن کا امتیاز، جو میرے نزدیک لازمی ہے اور جس کا قائم رکھنا خلط بحث سے بچنے کے لئے ضروری ہے، ثقافت کے لفظ کے اندر مبہم ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر تہذیب و تمدّن کی بحث دین کو شامل کرکے اور بھی زیادہ ژولیدہ ہو جاتی ہے۔ مسلمان کے نزدیک اس کا دین تمام زندگی پر حاوی ہے۔ یا زندگی کے تمام شعبوں پر اسے حاوی ہونا چاہیئے، اور تکمیلِ دین میں سبھی کچھ آجاتا ہے۔ عربی زبان میں اور اسلام کے اندر دین کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اس کے مفہوم میں اصولِ زندگی بھی ہیں اور طرزِ زندگی بھی جس کے لئے آج کل انگریزی میں WAY OF LIFE کی اصطلاح زیادہ رائج ہو گئی ہے۔ اب قومیں جنگ کرتی ہیں تو دین یا کلچر یا مال و جان کی حفاظت کا نام نہیں لیتیں بلکہ یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم اپنے WAY OF LIFE کو دشمن سے بچانا چاہتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کے دَور میں جب رسولِ کریمؐ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے دفاع کے لئے جنگیں لڑنی پڑیں تو وہ کہتے تھے کہ ہم دین کی حفاظت کے لئے لڑتے ہیں۔ اور دین کی حفاظت کا مفہوم ان کے نزدیک صرف اپنے مخصوص دین کا بچاؤ نہ تھا بلکہ عام آزادیِ ضمیر تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہم ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر شخص اور ہر ملّت بے کھٹکے اپنے عقاید اور اپنے طریق پر زندگی بسر کر سکے۔ "لا اکراہ فی الدین" میں ہر شخص کا دین شامل تھا۔ اور دین میں وہ سب کچھ داخل تھا جسے آج کل یا کلچر کہتے ہیں یا WAY OF LIFE۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام اقوامِ اسلام کا اگر دین ایک ہے تو اس کا طرزِ زندگی بھی ایک ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا جواب ذرا تفصیل سے دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام سے قبل اکثر ظواہر و شعائر میں رسولِ کریمؐ کا اور ان کے پیرؤوں کا جو بعد میں رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہوئے ایک طرزِ زندگی تھا۔ انفرادی طور پر ہر فرد کی زندگی دوسرے افراد سے کم و بیش مختلف ہوتی ہے لیکن ایک قوم کے لوگوں میں بہت کچھ مشترک بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے لباس میں بہت یکسانی ہوتی ہے۔ ان کی خوراک میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کی پوشش، ان کی رہائش، ان کے مکان اور رسم و رواج کی بہت سی چیزیں باہم ہم رنگ اور دیگر اقوام سے متمائز ہوتی ہیں۔ بہت سے طریقے

معاشی وسائل کی پیداوار ہوتے ہیں اور بہت سی چیزیں آب وہوا اور عام جغرافیائی ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب نبی کریمؐ جیسا ایک انقلابی مصلح اعظم آتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ لیکن سب کچھ نہیں بدلتا۔ اور نہ ہی ایسا مصلح حکیم یہ کوشش کرتا ہے کہ خواہ مخواہ ہر چیز کو بدل ڈالے۔ اس لحاظ سے نبی کی زندگی کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک قومی پہلو ہوتا ہے جس میں وہ اپنی قوم کا ایک فرد ہوتا ہے۔ وہ قوم کی بولی بولتا ہے۔ اپنی قوم کا لباس پہنتا ہے۔ اس کا گھر بھی دوسروں کے گھروں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مخصوص قومی مزاج کے بھی بہت سے عناصر اس کے اندر رہوتے ہیں جن کو بدلنے کی اس کو کوئی خاص ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ قوم کی اصلاح بھی وہ قوم کے مزاج اور اس کے حالات کو مدِّ نظر رکھ کر کرتا ہے۔ بعض باتیں اس کو اپنے نزدیک مناسب معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کے مزاج کو زیادہ ٹھیس نہیں لگانا چاہتا اس لئے وہ ایسی تبدیلی پر مصِرّ نہیں ہوتا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ اگر قوم کے جذبات کو ٹھوکر لگانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں کعبے کی تعمیر میں ایسی تبدیلی کرتا جو اصل ابراہیمی نقشے کے مطابق ہوتی۔ میرا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ اگرچہ دین اسلام ایک واحد نظریۂ عبادت کا نام ہے لیکن آغازِ اسلام میں حجاز کی زندگی سے باہر آنے کے قبل بھی مسلمانوں کے طریقِ زندگی میں سب کے سب عناصر اسلامی نہ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس موضوع پر کہ نبی کی زندگی کا ایک قومی پہلو بھی ہوتا ہے جو تمام اقوام اور تمام ادوار پر لازماً قابلِ تقلید نہیں ہوتا، نہایت حکیمانہ بحث کی ہے۔ اب سوچیئے کہ تکمیلِ دین کے کیا معنی ہیں اور دین سے مسلمانوں کو کیا مفہوم لینا چاہیئے۔ ازروئے قرآن دین کی اصل عقیدۂ توحید اور مکافاتِ عمل ہے۔ اسلام کے اساسی عقائد کچھ اخلاقی اور روحانی اقدار ہیں جن کو محفوظ رکھنے کے لئے کچھ شعائر کی تلقین ہے۔ اخلاقی اقدار میں انفرادی اخلاقیات بھی آجاتی ہیں اور افراد اور ملل کے باہمی روابط بھی، جن کی نسبت بنیادی اصول قرآن میں اور تلقین اُسوۂ رسول میں موجود ہیں۔ حیاتِ انسانی ایک تغیر پذیر اور ارتقاء کوش حقیقت ہے۔ لہٰذا اسلامی ثقافت یا مسلمانوں کی ثقافت ہمیشہ کسی ایک نقشے پر قائم نہیں رہ سکتی۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے دو دن یکساں ہوں، یعنی جس نے کل کے مقابلے میں آج کوئی ترقی نہیں کی، وہ شخص گھاٹے میں ہے۔ (من استواء یومین فھو مغبون۔ یہی حال اقوام کا ہے۔ قومیں جب تہذیب و تمدن میں آگے نہیں بڑھتیں تو یا پیچھے ہٹنے لگتی ہیں یا جامد ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن اقوام میں حرکت ہوتی ہے ان میں حرکت، برکت اور قوت پیدا کرتی ہے۔ جس کی بدولت وہ پس ماندہ اور جامد اقوام پر غالب آجاتی ہیں۔ مغلوب اقوام کی دنیا اور دین دونو کو بیک وقت زوال آتا ہے۔

حجاز کا تمدّن زیادہ تر قبیلوی تمدّن تھا۔ بہت سے حصّے کی زندگی بدوی زندگی تھی جو تمدّن کے لحاظ سے نہایت پست ہوتی ہے۔ اس بدوی اور قبیلوی زندگی میں خصائلِ حسنہ کے ساتھ ساتھ بعض نہایت مذموم روایات و عادات بھی پائے جاتے ہیں اسی لئے رسولِ کریمؐ نے فرمایا "الاعراب اشد کفراً ونفاقاً" لبِ لباب یہ ہے کہ اسلام کا زاویۂ نگاہ زندگی کی نسبت نہایت صالح اور بلند تھا۔ اس نے اچھے رجحانات پیدا کئے جو تہذیب و تمدّن میں رنگا رنگ کے گل و ثمر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ رجحانات نہایت جاندار اور نشو پذیر تخم تھے جن کو نخل بننے کے لئے معاشی حالات کی زرخیز زمین درکار ہے۔ قرآن کی وحی "اقراء" سے شروع ہوتی ہے اور یہ حکم ایسے شخص کو ہُوا جو خود پڑھ نہ سکتا تھا۔ خدا کی مشیت یہ کہہ رہی تھی کہ تجھے تو امی ہونے کے باوجود حکمت سے مالا مال کر دیا گیا ہے۔ بقول حافظ:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانۂ ہفت ملت بشست

نگارِ ما کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت — بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

لیکن تیری اُمت کو دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ پڑھنا لکھنا چاہیئے۔ اس "اقراء" کے ساتھ علم بالقلم بھی ہے۔ قرآن کی ایک دوسری صورت میں قلم کی قسم بھی موجود ہے۔ اس تلقین کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمان سب سے زیادہ پڑھنے لکھنے والی قوم بن گئے۔ رسولِ کریمؐ نے ناخواندہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا اسیرانِ جنگ کا فدیہ قرار دیا۔ خود قرآن کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمان دنیا کے علوم و فنون پر پل پڑے۔ قرآن سے پہلے تمام عرب میں کوئی کتاب نہ تھی دیکھتے دیکھتے تمام اُمت کتاب خوانوں کا ایک متوالا گروہ بن گئی۔ لیکن نافہم لوگ مسلمانوں اور اسلام کی تحقیر کے مذموم جذبے کے ماتحت یہ کہتے رہتے ہیں کہ اصل اسلام میں کیا رکھا ہے اور آغازِ اسلام میں مسلمانوں کے پاس علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کا کچھ سرمایہ نہ تھا۔ اُنہوں نے جو کچھ لیا وہ دوسروں سے لیا۔ یہ ایسی ہی احمقانہ بات ہے کہ کوئی شخص کسی نخل میوہ دار کے بیج کو دیکھ کر کہے کہ اس تخم حقیر میں کیا رکھا تھا۔ درخت نے جو کچھ لیا وہ مٹی سے لیا، پانی سے لیا اور سورج کی کرنوں سے اخذ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جمادات کے ان تمام عناصر کو اسی ایک چھوٹے سے بیج نے حسین و جمیل اور حیات پرور زندگی میں تبدیل کر دیا۔ دیگر اقوام میں علوم و فنون کا بے شمار خام مواد موجود تھا اور بہت سے کمالات جا بجا منتشر تھے لیکن چونکہ ان اقوام کی نفسی اور روحانی زندگی مفلوج ہو چکی تھی ان کے معلومات زندگی کی تعمیر میں کام آنے کی بجائے ان کی تخریب کا باعث بن رہے تھے۔

اسلام چند صدیوں میں دُنیا کی بیشتر متمدّن اقوام میں پھیل گیا اور ہر جگہ اس کو مخصوص حالات